ڈاکٹر میاں مشتاق احمد

عہد حاضر میں عروضی شعور

انجمن ترقی ءاردو کراچی سے جناب ادیب سہیل کا خط آیا ہے کہ صاحبانِ قلم کو شخصیات پر نہیں بلکہ ادبی مسائل پر قلم اُٹھانا چاہیے۔ میں صاحبانِ قلم میں تو خیر کہاں؟ لیکن انہوں نے میرے دل کی بات کہہ کر مدت سے دبی آرزو کو جگا دیا کہ کچھ مسائل جو خالصتاً زبان وادب کے متعلق ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ روز واسطہ پڑتا ہے اور دل دُکھتا ہے بلکہ حسرت ہوتی ہے کہ کہیں یہ مسائل زیر بحث آسکیں تو شاید کچھ لوگوں کو ساتھ ملایا جاسکے اور ان کے ازالے کی کوئی سبیل نکل سکے

ان میں سے ایک اہم اور غور طلب مسئلہ عہد حاضر کے عروضی شعور کا ہے جو اہل علم وادب کی غائر توجہ کا بجا طور پر سزاوار ہے میں اس فورم کے ذریعے سے اپنی گذارشات پیش کرتا ہوں

یقیناً ادب کی مکمل اور واضح و جامع تعریف میں کئی ابہام اور گنجائشیں رہ سکتی ہیں مگر شاعری کی پہچان میں کوئی ابہام نہیں اور نہ کبھی تھا کہ کلام موزوں شعر ہے۔ فقرے اور مصرعے میں اٹل فرق وزن کا ہے۔ اس میں کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ یار لوگوں کو شاعر کہلوانے کا اور شعر فہمی کا دعویٰ تو ہے لیکن اوزان کا شعور تردد طلب امر ہے سو گراں ٹھہرا، اس سلسلے میں کئی موشگافیاں ہوئیں، نثری شاعری کی باتیں کی گئیں مگر جچا کچھ بھی نہیں۔ جناب اشفاق احمد نے طرح لگائی کہ نثر کا بھی ایک وزن ہوتا ہے لیکن شاعری اور نثر کا فرق قائم رہا اور رہے گا

ادب کی عمارت صرف تخئیل و جذبات پر انحصار نہیں کرتی بلکہ اسے آراستگی کی ضرورت ہوتی ہے اور شعر تو خالصتاً شعور کا مظہر ہے اس کی قدر کا تعین انتخابِ لفظ اور ترتیبِ لفظ پر منحصر ہے۔ جس کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں بیان کو کسی نہ کسی ریاضیاتی فارمولے کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے یعنی عروضی سانچہ طے کرنا ہوتا ہے ورنہ وہ جو کچھ بھی ہو، شعر نہیں کہلا سکتا کہ شعر کو باوزن ہونا لازم ہے

یہی اس کا بنیادی تعارف و تشخص ہے۔ یہیں ادب اور سائنس کی سرحدیں قاب قوسین ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں رہتے بلکہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اس میں خلق کا عمل بھی ہوتا ہے یعنی یہاں خیالِ تازہ کی نمو بھی اپنی جلوہ گری کرتی ہے اور دنیائے سائنس کی انتہا ریاضی بھی اپنے سارے قواعد وضوابط نافذ کر رہی ہوتی ہے۔ اس لیے شاعری بہت سی کج بحثیوں سے آزاد ہو کر سرخروئی پاتی ہے اور سب کے من موہ لیتی ہے

لیکن کلچر بڑی سچائی ہے جو سب پر غالب رہتی ہے، جس میں عہد اور علاقے کے اجتماعی رویے اور ترجیحات متعین ہوتی ہیں۔ اس دور میں کلاسیکی موسیقی کے استادوں حتیٰ کہ نصرت فتح کو بھی تیز موسیقی کا ساتھ دینا پڑتا ہے کیونکہ یہ وقت کی آواز تھی اور تہذیب کا دھارا یہی رخ اختیار کر چکا تھا۔ آج کوئی موسیقی شناس عطا اللہ اور پوپ گانے کو لاکھ بے سُرا کہتا پھرے، عوام کی پسند اور ترجیح ان کے حق میں ہے جس کی سیسنس لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں اور برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیا میں اس کے شائقین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اس صورتِ حال کی وجہ عوامی رجحان ہے۔ وہ زمانے لد گئے جب گانے والا بے سُرا ہونے پر پکڑا جاتا تھا کہ سامعین فن شناس تھے۔ یہ صرف کن رس ہونے کی بات نہیں تھی بلکہ لکھنو کے کوٹھے ہی نہیں وہاں کے نواب بھی موسیقی و عروض کے شناور تھے۔ اردو ادب کے عہدِ زرّیں میں سودا کی شوکتِ الفاظ کی کیا کیا قدر نہ ہوئی۔ میر کو روز ہی ملتے تھے انشاء و مصحفی کی تازہ تخلیقات پر بحثیں چل نکلتی تھیں۔ آتش و ناسخ کے قدر دانوں میں فن شناسی بنیادی پتھر تھی، لوگ یونہی انیسے و دبیرے نہیں کہلواتے تھے۔ انہیں اپنے مدمقابل گروہ کے شائقین کو دلیل دینا پڑتی تھی جس کے لیے شاعری کے علم سے گہری آشنائی شرط تھی۔ یعنی ادبی اور خاص طور پر شعری شعور افزوں تھا اور پورے معاشرے میں ادبی مسائل اس طرح قواعد وضوابط کی سان پر چڑھائے جاتے تھے جیسے آج کل جمہوری و سیاسی مسائل زیر بحث آتے ہیں اور موضوعِ شہر بنے ہوئے ہیں یا کرکٹ کے تازہ کھیل پر ہونے والے پیچیدہ تبصرے

اس عہد میں بھی الحمدُ اللہ! زبانیں باقاعدہ پڑھائی جا رہی ہیں۔ ہمارے ہاں خاص طور پر اردو زبان و ادب تو انٹر کا اس تک لازمی مضمون ہے اور اسے پاکستان میں سبھی پڑھتے ہیں لیکن یہ فرض کچھ اس طرح پورا کیا بلکہ نمٹایا جا رہا ہے کہ پڑھنے والے تو خیر! پڑھانے والے بھی اسے پاس کرنے

اور کرانے کی حد تک مدِ نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں تعلیم برائے علم کا تصور کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ تعلیم برائے نوکری ایک مروّج کلیہ بن گیا ہے تو بہت سی چیزیں جن کے بغیر کام چلایا جا سکتا ہے، چھوڑ دی جاتی ہیں اور زیادہ دردسری سے گریز کر لیا جاتا ہے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ ایم اے اردو کر لینے اور اس کے بعد بطور لیکچرار یا ماہر مضمون اردو کے طور پر ملازمت کرنے والے اکثر اساتذہ کرام یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کی سطر، جُملہ ہے یا مصرعہ اور اگر وہ مصرعہ نہیں رہا یعنی بے وزن ہو گیا ہے تو کس بنیاد پر؟ کچھ سینئر استاد اپنا بھرم بچائے ہوئے ہیں کہ کبھی انہوں نے اس سلسلے میں مشق بہم پہنچا لی تھی مگر اب کبھی اس کے استعمال کی نوبت شاذ ہی آتی ہے سو وہ سب طاقِ نسیاں ہو رہا ہے

ان اساتذہ کو یہ بنیادی اصول سیکھنے کی طلب و خواہش ہے مگر سکھائے کون؟ ڈگری یا ملازمت کے لیے تو اس بکھیڑے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور کالجوں میں تو عالم یہ ہے کہ ایف اے کی مجبوری طے ہوتے ہی استاد طالب علموں کو اردو زبان و ادب کی تعلیم مزید سے ڈرانے لگتے ہیں کہ یہ بہت طویل ہے .....اس میں نمبر بہت کم آتے ہیں.....اس کی مارکیٹ ویلیو نہیں ہے.....اور جانے کیا کیا کچھ کہا جاتا ہے تا کہ اضافی بوجھ سے بچا جا سکے

اس ضمن میں سب سے مضحکہ خیز صورتِ حال تحقیق و تنقید کی ہے۔ سب کو شاعری پسند ہے سب کسی شاعر پر کام کرنا چاہتے ہیں حتیٰ کہ شاعروں کے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے ادھر کوئی بڑا شاعر اللہ کو پیارا ہوا، ادھر کسی جامعہ میں اس موضوع پر تحقیق کے لیے خاکہ تیار بلکہ زیرِ بحث ہوتا ہے۔ ہر جامعہ میں (جہاں شعبہ اردو موجود ہے) ہر سال ایم اے کے پرچے کے طور پر تحقیقی و تنقیدی مقالات کرائے / لکھوائے جاتے ہیں اور ڈھونڈے سے بھی کوئی شاعر نہیں ملتا جس پر کام کرنا باقی ہو۔ یوں سینکڑوں کی تعداد میں مرحوم و موجود شاعروں پر کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ان میں ایک بھی تھیسس (مقالہ) ایسا نہیں جس میں عروضی تجزیہ موجود ہو۔ یہ کیسی پرکھ ہے؟ اور کیا شاعری کا تجزیہ اوزان کی بحث کے بغیر کیا جا سکتا ہے؟ کس شاعر کے ہاں کونسی کونسی بحریں کس کس صورت میں برتی گئی ہیں؟ ان میں کیا کیا تجربات دیے ہیں؟ کیا واقعی اس شاعر نے ساری باوزن شاعری کی ہے اور اگر کہیں ٹھوکر کھائی ہے تو کہاں اور کیسے؟ یہ سب کہیں نہیں لکھا جاتا بلکہ کبھی اس کمی کی طرف توجہ بھی نہیں دلائی جاتی، ممتحن اس مقالے کی جانچ

پرکھ بھی کرتے ہیں اوران پر تقریباً سارے نمبر عطا کر کے اسے دنیا کا بہترین مقالہ تک قرار دیتے ہیں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اس شاعری کے تجزیے میں عروضی بحث کی توجہ تک نہیں دلاتے اور یہ عمل محض ایم اے کے مقالات تک رہتا تو زیادہ قلق نہ ہوتا لیکن یہاں تو ایم فل حتیٰ کہ پی ایچ ڈی کے مقالات کا حال یہی بلکہ اس سے بھی برا ہے جہاں پوری کی پوری صنفِ شاعری زیر بحث آجاتی ہے یعنی وہ موضوع ایک طرح سے مکمل ہو جات اہے اور مزید تحقیق وتنقید کے لیے بند ہو جاتا ہے لیکن وہ محض شعرا کے ناموں اوران کی کتابوں کی فہرست کے علاوہ چند چلتے ہوئے بے معنی سے جملوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اس شاعری پر لکھے گئے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں شاعرانہ تجزیے کا کہیں نام و نشان نہیں ہوتا اوران پر نہ صرف ڈگری عطا ہو جاتی ہے بلکہ اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے جارہے ہوتے ہیں یہ سب کیا ہورہا ہے؟ ہم شاعری کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں؟ اسے کہاں لے جارہے ہیں؟ مقالات کی طویل فہرستوں میں تجزیہ گم ہورہا ہے.....دم توڑ رہا ہے.....اسے کون بچائے گا؟

اس صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم سب نقاد بنے بیٹھے ہیں اوراکثر شاعری پر طبع آزمائی کررہے ہیں مگر شاعر کی فنی رہنمائی کا عمل کہاں موجود ہے؟ آدھی صدی پہلے تک تو لوگ اقبال تک کی عروضی غلطیوں پر بحث کرنے کی اخلاقی جرأت وہمت رکھتے تھے لیکن اب کسی شاعر سے غلطی ہوتی ہی نہیں اور نہ ہی ناگزیر حد تک لائقِ توصیف کوئی پیمانہ تخلیق ہوتا ہے۔ یہ تنقید کے نقطۂ نظر سے مایوس کن صورت حال ہے، اس سے خود عمل تنقید کا مقام ومرتبہ اعتبار کھوسکتا ہے مگر اس مسئلے پر کسی نے سوچا کب ہے؟

ہمیں بحر الفصاحت والے نجم الغنی کی دردسری پر حیرت ہوتی ہے۔ انشاء کی عرق ریزی مضحک لگتی ہے۔ علم بلاغت کی ساری کتابیں اذق ہیں اسی لیے تو اب وہ کسی زبان کے نصاب میں شامل نہیں حتیٰ کہ عربی وفارسی والوں کے لیے بھی زائد ہوگئی ہیں۔

غضنفر حبیب اللہ کی کتاب اردو عروض اور جابر علی سید، عنوان چشتی، محمد امین، حسن عسکری اور گیان چند کے مضامین بھی قابل قدر ہیں مگر ابھی اس موضوع پر کام کی اشد ضرورت ہے بلکہ شاعری کو بنیادی طور پر اسی نہج سے پرکھا جانا چاہیے کہ یہی تحسین شعر کا حقیقی راستہ ہے۔

اسلم ضیاؔ کو داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے ناقدین کی لاج رکھ لی انہوں نے ''علم عروض اور اردو شاعری'' کو ڈاکٹریٹ کے پروگرام کا موضوع بنا کر جہاد کیا ہے، ان کا موجودہ کام ''اوزان اقبالؔ'' بہت اہم کام ہے اس سلسلے میں ان کا مقالہ ''فیضؔ کی شاعری کا تجزیہ'' انتہائی قابل قدر ہے